اجتہاد اور عصر حاضر کے تقاضے

* ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

اسلام کی ابتدائی صدیوں کے فقہاء اور ائمہ مجتہدین روشنی کا مینار تھے۔ان کی مساعی اور دانائی کے سبب امت کے سماجی امور، باہمی معاملات اور مالی نظام میں وحدت عمل پیدا ہوئی اور یہی وحدت، عبادات، خاندانی نظام اور شخصی قوانین میں نظر آنے لگی۔اس اتحاد نے دین اور فکری ہم آہنگی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ اس سماجی اور قانونی انتشار سے محفوظ رہی جس کا دوسری قومیں اپنے ابتدائی دور میں شکار ہوئیں۔اور اس انتشار نے انہیں آہستہ آہستہ مذہب سے بہت دور دھکیل دیا اور اس طرح ایک ایسا نظام وجود میں آ گیا کہ قومیں اپنے ادیان کی مبادیات اور اصول وقواعد کو چھوڑ کر دوسری قوموں کی خوشہ چینی میں مصروف ہوگئیں یا ''دین سیاست سے جدا ہے'' کے مفروضے کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا۔

اگر (اسلام کے) دور اول کے فقہاء اجتہاد اور احکام کے اخذ واستنباط میں تساہل سے کام لیتے اور جاں گسل محنت ومشقت پر (جوانہوں نے اٹھائی) آرام وراحت کو ترجیح دیتے تو ہرگز وہ شاندار علمی نتائج اور کارنامے سامنے نہ آتے جو آج تک زندہ وتابندہ ہیں، تدوین قانون اور اجتماعی مسائل کے حل میں اگر ان کی غیر معمولی کاوشیں نہ ہوتیں تو زندگی کی عملی مشکلات اور ترقی پذیر تقاضوں کے پیش نظر مسلم حکومتیں مجبور ہو جاتیں کہ رومی اور ایرانی قوانین اور نظاموں سے خوشہ چینی کریں کیونکہ انتظامی ڈھانچے کو چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔اور قانون سازی کے انتظار میں زندگی کی حرکت کو کوئی معطل نہیں کرسکتا۔معاشرے میں جس رفتار سے مسائل ہوتے ہیں، اگر اسی رفتار سے ان کے حل کی راہ نہ نکالی جائے تو معاشرہ افراتفری کا شکار ہو جاتا ہے، محرومی کا احساس اسے گھیر لیتا ہے اور پھر وہ معاشرہ، یا حکومت دوسروں کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے۔لوگوں کے خواہ دینی فرائض ہوں یا کاروباری معاملات وہ ان کی ادائی اور بجا آوری میں اس بات کا انتظار نہیں کر سکتے کہ علماء رہنمائی کا فرض ادا کریں، اور ماہرین قانون کوئی قانون بنائیں اور نظام تیار کریں تب ہم اپنا فرض ادا کریں اور آگے بڑھیں۔

---

* سابق صدر شعبہ قرآن وحدیث، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

اگر اسلام کے صدر اول میں ایسا ہوتا ہے تو یہ امت کی بڑی بدبختی ہوتی، وہ اسلامی قانون کی نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہو جاتی، وہ زیادہ سے زیادہ ایک متقی، پرہیزگار امت کی حیثیت سے مسجدوں میں محدود ہو جاتی لیکن ان کے گھروں، بازاروں اور عدالتوں میں دین کی کوئی نمود نہ ہوتی، ان پر جاہلیت کے مہیب سائے چھا جاتے اور مسلمانوں کا حال ان ملکوں اور ریاستوں سے مختلف نہ ہوتا جن کا سرکاری مذہب عیسائیت ہے لیکن وہ عیسائی قانون سے محروم ہیں۔

عہدِ اول کے علماء نے اجتہاد کے عمل کو جس بھرپور طریقے سے جاری وساری کیا، اس کی بدولت ہی فقہ کی بلند و بالا عمارت کی تعمیر ممکن ہوئی، اور اجتماعی اور حکومتی سطح پر قوانین اسلام کا نفاذ ممکن ہو سکا۔ اس دعوے میں مبالغے کی کوئی آمیزش نہیں کہ اجتہاد اسلامی شریعت کے لیے بمنزلہ روح کے ہے، اور فقہ کا تمام تر چشمہ حیات اجتہاد ہی ہے یہ بات تسلیم کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اسلامی شریعت معاشرے میں نافذ ہو، اپنا کردار ادا کر رہی ہو، اس کا ایک زندہ اور متحرک فقہی نظام موجود ہو جو لوگوں کو تسلسل کے ساتھ مربوط و منظم کر رہا ہو۔ لیکن یہ سب کچھ اجتہاد کے بغیر ہو رہا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اجتہاد کا عمل رسول اللہ ﷺ کے عہد سعید ہی سے شروع ہو گیا تھا جب کہ اللہ کی آخری شریعت وجود میں آئی تھی۔ اجتہاد اسلامی شریعت کے لیے روح اور فقہ کے لیے زندگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اجتہاد کا ایک مضبوط، کبھی نہ ٹوٹنے والا تعلق اسلام کے مقصد اور اس کی خصوصیات کے ساتھ قائم ہے۔

قرآن اور سنت کے واضح نصوص کی رو سے اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی مکمل اصلاح کی جائے۔ اس طرح کہ فرد اور جماعت، حال اور مستقبل کا کوئی معاملہ اس کی عملداری سے باہر نہ ہو۔ اسلام کے بارے میں ایک مسلمان کا یہی عقیدہ ہے اس میں کمی یا ترمیم اسے اسلام کے دائرے سے باہر کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ:

> ''یہ ممکن نہیں ہے کہ حال یا مستقبل میں کوئی واقعہ رونما ہو اور اسلامی شریعت میں نص، قیاس یا اجتہاد پر مبنی کوئی حکم اس کے لیے موجود نہ ہو۔''

یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کہ اسلام کا مقصد انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی اصلاح ہے، یہ بات بھی تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اجتہاد، اسلامی شریعت کے لیے بمنزلہ روح کے ہے اور فقہ کا سرچشمہ حیات ہے۔ اس لیے یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ شریعت آخری اور دائمی ہو، اور اس میں ہر موجود اور ممکن الوقوع واقعہ کے لیے ایک حکم بھی موجود ہو لیکن اجتہاد اور اخذ و استنباط احکام کا اصول قائم و دائم نہ ہو۔

اس حقیقت کو علامہ شہرستانی (م: ۵۴۸ھ) ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

> ''عبادات اور انسانی اعمال و افعال اور تصرفات میں اتنے حوادث اور واقعات ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں، اس کثرت سے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا اور ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ ہر واقعہ کے بارے میں (قرآن اور سنت میں) کوئی نص وارد نہیں ہوا، اور اب کا امکان بھی نہیں، جن مسائل اور واقعات کے بارے میں نصوص ہیں، وہ محدود ہیں اور جو نو بہ نو مسائل اور واقعات پیش آتے ہیں وہ غیر محدود اور لا متناہی ہیں۔ ایک محدود اور متناہی احاطہ انہیں اپنے اندر کیسے سمیٹ سکتا ہے۔ اس صورت حال نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اجتہاد اور قیاس دونوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے حل مسائل کے لیے ان سے مفر ممکن نہیں۔'' (۱)

اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اجتہاد کا بند ہو جانا اسلامی شریعت کی خصوصیات کے منافی ہے۔ اجتہاد کا عمل عہد رسالت ہی سے شروع ہو گیا تھا، ابتدائی چار صدیوں میں امت اجتہاد پر قائم رہی اور علماء اس پر عمل پیرا رہے۔ چاروں فقہی مسالک کی کتابیں اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ جب مسلمانوں میں سیاسی انحطاط شروع ہوا تو اجتہاد کا عمل بھی پژمردگی اور کمزوری کا شکار ہوا۔ تاتاری یلغار کی وجہ سے ذہانت کے سوتے خشک ہو گئے، ہمتوں میں ضعف آ گیا اور جو قومیں تاتاری اور مغل حکومت کے زیر اثر آئیں، وہ مسلح اور غیر مسلح دباؤ کے آگے پسپا ہو گئیں۔ چنانچہ مسلم علماء خاص طور پر عالم اسلام کے مشرقی حصے کے علماء نے اس وقت اجتہاد کے ارتقاء میں رکاوٹ محسوس کی۔ جس کے اسباب حکام کی سخت گیری کا خوف، حکومت کی سیاسی مصلحتیں، ارباب اقتدار کی طرف سے دینی معاملات میں عدم دلچسپی، قاضیوں اور مفتیوں کے کام میں مداخلت۔

ان حالات نے علماء کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اجتہاد کے عمل کو جاری رکھنے میں نفع سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔اس خوف نے انہیں اجتہاد کا دروازہ بند کرنے پر مجبور کیا کہ اس کے ذریعے دین میں تحریف کا عمل شروع نہ ہو جائے۔

مسائل میں تفریع، توسیع اور تخریج کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اس کے ساتھ مسالک اربعہ کے متبعین میں اکابر علماء کی اپنے اپنے مسلک کے مطابق تصانیف کا سلسلہ طویل ہوا، اور ان حضرات نے محسوس کیا کہ اب فقہ تمام ضروری تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اجتہاد مطلق رکھنے والی شخصیتیں بھی ختم ہو چکی ہیں اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ لوگ کسی کے علم وتقویٰ کے دھوکے میں آجائیں اور وہ اجتہاد کا دعویٰ کر بیٹھے اور حقیقت میں وہ اس کا اہل نہ ہو اور پھر اس طرح کے لوگوں کے ہاتھوں دین میں خرابی کی بنیاد پڑے۔اس بناء پر مسالک اربعہ کے ماننے والے علماء نے چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے کا فتویٰ دے دیا۔

اس امر کو امت مسلمہ کی بدنصیبی ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا بھی دور آیا کہ جن ذہین فقہاء نے احکام کے دلائل سے بحث کی، اور ان کے اسباب وعلل معلوم کرنے کی کوشش کی انہیں مطعون کیا گیا اور ان کے لیے طرح طرح کی سزائیں تجویز کی گئیں۔

اس طرز عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں برسر اقتدار مسلم حکام یہ سمجھنے لگے کہ شریعت اور فقہ ملک کو وہ ضروری نظام مہیا نہیں کر سکتے جو تجدد پسند اور تغیر پذیر عصری تقاضوں کو منظم کر کے ان کا قابل عمل حل مہیا کر سکے۔اس صورت حال کے نتیجے میں حکام وقت نے غیر اسلامی قوانین کا سہارا لینا شروع کر دیا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ فقہ اور شریعت حکومت کے ایوانوں سے باہر آ گئی اور ان کی تگ وتاز مدرسوں اور کتب خانوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔

بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں جو نتائج سامنے آئے، ابن قیم جیسے زیرک اور نکتہ رس فقیہ نے ان کی بو آٹھویں صدی ہی میں سونگھ لی تھی، انہوں نے اپنی دوگراں قدر تصانیف ''اعلام الموقعین'' اور ''الطرق الحکمیہ'' میں اس بات پر افسوس اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے کہ فقہی مسالک کے متعبین نے شریعت کے سرچشموں کو خشک اور

وسعتوں کو اس حد تک تنگ کر دیا ہے کہ ارباب حل و عقد مجبور ہو گئے ہیں کہ وضعی قوانین سے مدد لے کر انسانی ضروریات کو پورا کریں۔ حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ تنگی نہ شریعت میں ہے اور نہ فقہ میں۔ صدر اول کے فقہاء اس ضمن میں جو کام کر گئے ہیں اور امت مسلمہ کے لیے جس نہج پر حل مسائل کی راہ ہموار کر گئے ہیں، اس کا دامن کبھی تنگ نہ ہوگا، اس کی وسعتیں کبھی محدود نہ ہوں گی۔ تنگی اگر ہے تو وہ فقہی مسالک کے پیروؤں میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک اسلام کی خصوصیات یقینی اور حتمی طور پر اجتہاد کے عمل کو لازمی قرار دیتی ہے، اس وقت تک کوئی بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ اس عمل کو بند کر دے۔ چاروں فقہی مسالک کے مقلدین میں سے بعض ایسے فقہاء نے جن کا تعلق طبقہ متاخرین سے ہے، اپنی کتابوں میں سے یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ اگر کوئی شخص مرتبہ اجتہاد کو پہنچ جائے اور اس کی ذات میں اجتہاد کی مطلوبہ شرائط و خصوصیات پائی جاتی ہوں، تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلک کی تقلید کرے۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی شخص ان شرائط کو پورا کرتا ہے اور درجہ اجتہاد پر فائز ہو سکتا ہے۔

عزیز الدین بن عبدالسلام (م: ۵۴۸ھ) چھٹی صدی ہجری کے شافعی فقہاء میں سے ہیں، ان کا کہنا ہے:

> ''اس بات میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے؟ اس بارے میں کئی اقوال نقل کیے جاتے ہیں لیکن یہ تمام اقوال اس قابل نہیں کہ ان پر کان دھرا جائے اس لیے کہ اگر کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جس کے بارے میں کوئی نص پہلے سے موجود نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کتاب اللہ یا سنت رسول ﷺ کی روشنی اور اس کے بیان کردہ اصول کی پیروی کرتے ہوئے اجتہاد کرنا پڑے گا، اگر اجتہاد نہیں کریں گے تو اس کا حکم کیسے معلوم ہوگا؟ اس کے سوا کوئی شخص اگر اور کوئی بات کہتا ہے تو وہ ہذیان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔'' (۲)

اس حقیقت سے اغماض ممکن نہیں کہ فقہ اسلامی کی تشکیل کے دور میں ابتدائی مجتہدین کا انفرادی اجتہاد اس امت کے لیے خیر کثیر ثابت ہوا، اسی کی بدولت شریعت کی کھیتی کو کاشت کرنے اور سرسبز و شاداب رکھنے کے لیے اہل عزم و ہمت نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کیں۔ مستند اہل علم و فضل نے فقہی اصول و ضوابط مستنبط کرنے اور شریعت

کے نصوص کے مطابق اس کے نظریات وضع کرنے کا کام انجام دیا اور ایسی مخلصانہ مساعی کی بدولت بیش قیمت فقہی ذخیرہ مہیا کیا، ایک ایسا ختم نہ ہونے والا ذخیرہ جس کی مثال اقوام عالم پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ابتدائی تین صدیوں میں ان فقہی تخلیقات کا وجود میں آنا انفرادی اجتہاد کی بدولت ممکن ہوا۔

> ''علمائے امت نے ممکنہ خطرات کے پیش نظر مناسب سمجھا کہ انفرادی اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے بعد جو حالات سامنے آئے ان کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ عالم اسلام کو مزید انتشار سے بچانے کے لیے یہی تدبیر اور مسلم علماء کا یہی فیصلہ مصلحت پر مبنی تھا۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ اجتہاد کے دروازے کو مستقلاً بند سمجھا گیا، جس کے سبب نوبت یہاں تک پہنچی کہ فقہ اور شریعت پر جمود اور حل مسائل میں عاجز و درماندہ ہونے کی تہمت لگ گئی۔'' (۳)

انتشار اور دینی معاملات میں تحریف سے بچنے کے لیے اجتہاد کے عمل کو موقوف کرنے سے کہیں بہتر یہ ہوتا ہے کہ بحیثیت ادارہ اسے منظّم کیا جاتا، اور اس ذمہ داری کو افراد کے بجائے جماعت کے سپرد کر دیا جاتا۔ اگر اجتہاد کا دروازہ کلی طور پر بند کر دیا جائے تو پھر اس سے یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ اسلام صرف ابتدائی تین یا چار صدیوں کے لیے آیا تھا اور کتاب و سنت مأخذ و قانون صرف اسی دور سعید تک کے لیے تھے۔ اس دور سعید کے اہل علم کی خصوصیت تو یہ تھی کہ وہ زندگی کے ہر نئے تقاضے اور پیش آمدہ مسئلے کو قرآن اور سنت کی روشنی میں حل کرتے تھے اور قرآن حکیم کے اس حکم اور ہدایت پر مکمل طریقے سے عمل پیرا تھے:

> ﴿ وَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ (۴)
>
> ''اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔''

ایک عرصے تک صورت حال یہ رہی کہ چار مسا ا کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں رہتے ہوئے اجتہاد مقید کا عمل جاری رہا۔ اس عمل میں چاروں مسالک کے ، فقہاء نے حصہ لیا، ان حضرات نے پیش آمدہ مسائل کا

حل اپنے مسلک کے اصول وضوابط کی بنیاد پر اس طرح نکالا کہ مسلک کے مسائل مقررہ پر قیاس کر کے نئے احکام کا استخراج کیا یا استحسان اور مصالح مرسلہ کے قاعدے پر عمل کرتے ہوئے اجتہاد کیا۔

مثال کے طور پر اسی طریقہ اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے پانچویں صدی ہجری میں حنفی مسالک میں بیع الوفاء کے احکام کی بنیاد رکھی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ سرمائے کی گردش اور قرضوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر ربا (سود) کی مشکلات کا حل نکالا جائے۔ اسی طرح مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے متاخرین فقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ ایسا کوئی وقف یا مالی تصف قابل نفاذ نہیں ہوگا جو کسی مقروض سے قرض لیتے ہوئے اموال میں کیا ہو۔ تاوقتیکہ قرض خواہ اس پر آمادہ نہ ہو۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مقروض لوگ وقف یا ہبہ کو قرض خواہوں سے اپنا مال محفوظ کر لینے کا ذریعہ نہ بنالیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے مسائل میں بھی استحسان کی بنیاد پر اجتہادی آراء کو اختیار کیا گیا۔

اجتہادی صلاحیتوں اور قابلیتوں میں مرورِ زمانے کے ساتھ رفتہ رفتہ کمی آجانے کی وجہ سے قدیم فقہی مسالک کے اندر رہ کر کیا جانے والا اجتہاد مقید کا عمل بھی کم ہوتا گیا یہاں تک کہ ایسا وقت آیا کہ فقہ نئی تخلیقات کے معاملے میں بانجھ پن کا شکار ہو گیا، اور فقہ کا جو ذخیرہ موجود تھا، علماء نے اس کے حفظ وتکرار پر اکتفاء کر لیا۔ حتیٰ کہ بعض ایسے حضرات جو علماء اور صفہاء میں شمار ہوئے تھے، فقہ کے مطالعے میں احکام کے دلائل معلوم کرنے کو بھی یہ کہہ کر ناپسند کرنے لگے کہ:

"ہمیں دلائل سے کیا بحث؟ یہ تو مجتہد کا کام ہے کہ وہ دلائل کا کھوج لگائیں۔"

حالانکہ خود مجتہدین نے اہل علم وفضل کو اندھی تقلید سے منع کیا ہے۔ (۵)

تیرہویں صدی ہجری میں ذہنی اور فکری انحطاط اس حد تک پہنچا کہ جو ذہین اور مخلص علماء اور فقہاء دلائل احکام سے بحث کرتے تھے، ان کو ہدف تنقید بنایا جاتا تھا اور ان پر آزاد خیالی کی تہمت لگائی جاتی تھی اور افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ آج کے عقلی اور سائنسی دور میں بھی ایسا طبقہ موجود ہے جو کلی طور پر اجتہاد کی نفی کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اب قیامت تک ایسے رجال کار کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے جو اہلیت اجتہاد کے حامل ہوں۔ ان حضرات کے بارے میں اگر ہلکی سے ہلکی اور شائستہ سے شائستہ کوئی بات کہی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ:

"یہ حضرات روح تشریع سے نا آشنا ہیں۔"

علماء اور بطور خاص برصغیر پاک و ہند کے علماء نے عمل اجتہاد کی بہت زیادہ سختی سے مخالفت کی، بجا کہ ان کی نیتیں نیک تھیں، اور وہ پوری دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر اجتہاد کے دروازے کو کھلا رہنے دیا گیا تو اس سے وہ لوگ غلط فائدہ اٹھائیں گے جو اس کے اہل نہیں ہیں۔ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ تہذیب مغرب اور تعلیم مغرب سے متاثر افراد اجتہاد کو آڑ بنا کر دین میں تحریف کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس تصور کے تحت انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ اب تقلید ہی میں عافیت ہے، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

لیکن میری رائے میں ان حضرات کی تمام تر نیک نیتی اور حق پرستی کے باوجود ان کی یہ سوچ یک طرفہ تھی۔ اس نے اگر ایک طرف دین میں تحریف کے دروازہ کو بند کیا (اگر چہ وہ بھی پوری طرح بند نہیں ہوا) تو دوسری طرف شرک و بدعت کا دروازہ کھول دیا۔

تقلید کے بارے میں یہ بات پورا زور دے کر کہی گئی اور عوام بلکہ نیم خواندہ اور اچھے خاصے خواندہ افراد کے ذہنوں میں یہ بات جما دی گئی کہ ایک عالم جو بات کہے اسے بے دلیل ماننا ضروری ہے۔ جو لوگ واقعی عالم دین ہوتے ہیں، قرآن و سنت کے علوم پر انہیں دسترس حاصل ہوتی ہے، ان کے فتوے اور بات کو بے دلیل ماننے میں کوئی حرج نہیں، لیکن صورت حال یہ ہوئی کہ سوا ایسے افراد میں جو اپنے آپ کو عالم، مفتی اور دینی علوم کا ماہر ظاہر کرتے تھے ان میں حقیقی عالم ایک ہی ہوتا تھا، سادہ لوح عوام کے لیے یہ تمیز مشکل تھی کہ ان میں کون اس درجے پر فائز ہے کہ اس کی بات بے دلیل مانی جائے اور کون اس درجے میں ہے کہ اس کی بات پر کان بھی نہ دھرا جائے۔

ان خود ساز علماء نے عوام کو گمراہ کیا، انہیں دین کے نام پر ایسی باتیں بتائیں اور ان کا عادی بنا دیا جس میں صرف ان کا اپنا ذاتی مفاد تھا۔ ان باتوں کا دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ سیلاب عوام میں آیا، یہ فساد عالم معاشرے میں برپا ہوا، ان کا تعاقب کرنے والے کم تھے اور جنہوں نے کیا ان کی وہ پذیرائی نہ ہو سکی کیوں کہ یہ حقیقت کو ظاہر کرنے والے تھے اور حقیقت تلخ ہوتی ہے، خود ساز علماء نے عوام سے جو کچھ کہا، جو کچھ انہیں سکھایا، وہ اَن پڑھ لوگوں کے لیے زیادہ پرکشش تھا، انہوں نے انتہائی ذہانت اور چالاکی سے عام لوگوں کو دین کے تقاضوں سے ہٹا کر اپنے تقاضوں کی

طرف ان کا رخ موڑ لیا اور یہ صورت حال جاری ہے، اس میں کمی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اجتہاد کی شدید مخالفت کے سبب ایسے لوگوں کا وجود بھی ختم ہو گیا جو اپنی اجتہادی قوت اور صلاحیت سے اس سیلاب کو روک سکتے۔

چند نا اہل افراد اگر اجتہاد کے ذریعے دین میں تحریف کی کوشش کرتے تو میرا خیال ہے کہ اس سے اتنا شدید نقصان نہ پہنچتا، ماضی قریب میں اس کی مثال موجود ہے۔ انکار حدیث کا فتنہ رونما ہوا، اس کی ابتداء علمی حلقے سے ہوئی، عوام سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا، اہل علم وفضل اور اہل حق نے اس کا تعاقب کیا، اور چند سالوں میں یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔ لیکن اجتہاد کا عمل نہ ہونے اور عوام کے دلوں میں یہ بات راسخ کرنے سے کہ کسی فتوے اور مسئلے کی دلیل پوچھنا ان کا حق نہیں ہے، شرک و بدعت کا جو سیلاب امڈا ہوا ہے، اس کے ختم ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

اگر گزشتہ چند صدیوں میں بھی اجتہاد کا عمل جاری رہتا تو وہ صورت حال یقیناً نہ ہوتی جو آج بہت سے علاقوں اور بطور خاص برصغیر میں ہے۔ حالانکہ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ اہل علم اس درجے کے ضرور پیدا ہوتے رہے جو اجتہاد کے عمل کو جاری رکھ سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ناچیز راقم کے خیال کے مطابق دو بنیادی مشکلات حائل ہیں انہوں نے ہمارے اکثر علماء کو مخمصہ میں ڈال رکھا ہے۔

ایک یہ کہ: جب کوئی اجتہاد کا نام لیتا ہے تو وہ چونک جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد سے اس قسم، اور اس درجہ کا اجتہاد مراد ہے جیسا امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے کیا۔ یعنی مجتہد مستقل کی حیثیت سے اور اب جو اجتہاد کرے گا وہ اصول وقواعد بھی اپنے وضع کرے گا اور پچھلے سارے ڈھانچے کو منہدم کر دے گا۔ حالانکہ جس شخص کو شرعی امور کی سوجھ بوجھ ہے، اور اس نے فقہی مسالک کا مطالعہ کیا ہے، وہ اگر اجتہاد کی بات کرتا ہے تو اس کی یہ مراد نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیش نظر یہ امر ہوتا ہے کہ صدر اول میں ائمہ مجتہدین نے اجتہاد کے لیے جو اصول وضع کیے تھے، انہی کو رہنما اور بنیاد بنا کر ان مسائل کا شرعی حل تلاش کیا جائے جو معاشرے کو اب درپیش ہیں۔

فقہاء نے مجتہد کی جو دوسری اور تیسری قسم بیان کی ہے۔ ''مجتہد فی المذہب'' اور ''مجتہد فی المسائل''۔ ان کی مراد ان دو صورتوں کے مجتہدین سے ہوتی ہے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ: عام طور پر ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اجتہاد کی اجازت دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی اجازت دے دی جائے گی اور ہر شخص کو کسی امام اور عالم کی تقلید سے منع کر دیا جائے گا۔ عہدِ رسالت سے لے کر آج تک نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ یہ ممکن ہے جو نہیں جانتے وہ ظاہر ہے جاننے والوں کی پیروی کریں گے اور انہیں کرنی چاہیے لیکن انہیں یہ باور نہیں کرانا چاہیے کہ اگر وہ فلاں امام کی پیروی نہیں کرے تو بے دین ہو جائیں گے فقہی مسالک کو دین کا درجہ جب تک حاصل رہے گا، عوام میں دین کی حقیقی روح بیدار نہیں ہوگی۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ (م: ۱۲۴۶ھ) نے اس حقیقت کی صحیح عکاسی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تقلید کے معنی یہ ہیں کہ دلیل دریافت کیے بغیر کسی کا حکم کیوں مانا جائے، اور یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے یہ کیوں حکم دیا ہے اور یہ بات کس بنیاد پر کہی ہے؟ سو اکثر لوگ جو اکثر مولویوں اور درویشوں کے بے سند کام اور کلام کو حجت سمجھتے ہیں اور دوسروں کے سامنے بھی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں، اس کی تحقیق نہیں کرتے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا، یا کہا؟ گویا وہ ان مولویوں اور درویشوں کو حاکم شرع سمجھتے ہیں ایسی تقلید بدعت اور حرام ہے'' (۶)

جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا اور نہ ہونا چاہیے، تو اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شخص کو اجتہاد کا حق ہے یا جس کا دل چاہے وہ احکام شرع میں اجتہاد و قیاس شروع کر دے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو اہل علم اس کے اہل ہیں انہیں پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کرنا چاہیے اور جو سابقہ اجتہادی مسائل ہیں جن کے احکام فقہاء نے عرف و عادت، یا کسی خاص علت کی بنا پر اخذ و معین کیے ہیں تو اس صورت میں ان احکام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے جہاں عرف بدل گیا ہو یا علت ختم ہو گئی ہو جس کی بنا پر حکم لگا تھا۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فقہاء کے نزدیک یہ اصول مسلم ہے کہ جو حکم علت کی بنا پر ہے، وہ اس علت کے زائل ہونے سے ختم ہو جائے گا اسی طرح عرف و عادت کا معاملہ ہے کہ اس کی تبدیلی سے بھی حکم بدل جائے گا جدید فقہاء اگر ایسا نہیں کریں گے تو وہ قدیم فقہاء کے ایک مسلمہ اصول کو توڑنے والے ہوں گے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے معاملات میں انہوں نے قدیم فقہاء کا اجتہادی مسلک چھوڑ کر نیا مسلک اختیار کیا ہے۔ جیسے تدریس قرآن اور امامت صلوٰۃ کا معاوضہ۔

اسلام کے عہدِ اول میں اساتذہ اور معلمین کے حکومت کی طرف سے وظیفے اور روزینے مقرر تھے اسی بناء پر امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے قرآن، حدیث اور امامت صلوٰۃ پر معاوضہ اور اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا تھا۔ مگر جب حکومت کی طرف سے دینی علوم کے اساتذہ کے وظائف بند ہوگئے اور ان کی معاشی کفالت کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو بعد کے فقہاء نے رواج بدل جانے، اور ضرورت پیش آجانے کے سبب اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔(۷)

تدریس قرآن اور امامت صلوٰۃ پر موجود حالات میں اگر معاوضہ نہ لیا جائے تو اس سے جہاں ایک طرف یہ اندیشہ ہے کہ مدرسین اور ائمہ صلوٰۃ کی مالی کفالت ختم ہونے سے لوگ ان فرائض کی انجام دہی سے کنارہ کش ہو جائیں گے کیوں کہ اس کے علاوہ ان کے پاس دوسرے مالی ذرائع نہیں ہیں۔ وہاں یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ جو لوگ دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کا اس کے سوا کوئی اور مصرف نہیں ہے۔ ان کے روزگار کی کیا صورت ہوگی؟

حدیث میں ہے کہ:

ایک مجلس میں دی جانے والی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی۔ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں اور پھر حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ عدالتی فیصلے بھی اسی کے مطابق ہوں گے۔ مگر دورِ فاروقی کے دو سال گزرنے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے دیکھا کہ طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے، سو آپ نے مصلحتِ عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ:

> ''اگر ایک مجلس میں بھی تین طلاقیں دی جائیں گی تب بھی وہ تین ہی شمار ہوں گی اور اس طرح شوہر کے لیے رجوع کا حق کلی طور پر ختم ہو جائے گا یہ فیصلہ آپ نے سزا کے طور پر کیا، اور یہ سمجھا کہ اس فیصلہ کے سبب ممکن ہے کہ لوگ محتاط ہو جائیں، اور بات بات پر تین طلاقیں دینے کی جرأت نہ کریں۔''
>
> اسی طرح کا ایک اور فیصلہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کیا اور وہ تھا ایک محدود مدت کے لیے چوری کی سزا کو معطل کیا۔ یہ حکم بھی خالصتاً مصلحتِ عامہ کی بنیاد پر تھا۔ حالانکہ چوری کی سزا بطور حد ہے جس میں کسی کو بھی ترمیم کا حق نہیں، اور نص قرآن سے ثابت ہے

اس کے باوجود حضرت عمر فاروقؓ نے لوگوں کی ضرورت اور مصلحت کی خاطر ایک خاص وقت تک کے لیے اسے معطل کیا۔

حدیث میں ہے کہ:

''تعزیر میں دس کوڑوں سے زیادہ سزا نہ دی جائے مگر حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال کی جعلی مہر بنانے والے کو سو کوڑوں کی سزا دی۔''

دورِ نبویؐ میں اور پھر دورِ صدیقی میں مقتول کی دیت، قاتل کی عاقلہ (برادری) پر ہوتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے برادری سے ہٹا کر متعلقہ محکمہ پر ڈالی۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ سبب تبدیل ہو گیا تھا باقاعدہ محکمے قائم ہو گئے تھے اور لوگ ان سے وابستہ تھے۔ (۸)

قدیم زمانے میں مکان کے تمام حصے (کمرے) یکساں ہوتے تھے، اور عام طور پر ایک ہی نمونے اور معیار کے بنائے جاتے تھے، اس لیے فقہاء کا یہ فتویٰ تھا کہ اگر کسی نے مکان کا ایک کمرہ دیکھ کر اس کا سودا کر لیا تو اس کا خیار رویت باطل ہو گیا تو متاخرین فقہاء کے زمانے میں مکانوں کا طرزِ تعمیر بدل گیا، ایک ہی مکان کے مختلف حصے مختلف قسم کے ہونے لگے تو فقہاء نے فتویٰ دیا کہ خریدار مکان کا ہر حصہ دیکھے، اگر ایک حصہ دیکھ کر سودا کر لیا تو خیار رویت حاصل رہے گا۔

تالیفِ قلب کا مصرف (اموال زکوٰۃ میں) قرآن حکیم کے نص سے ثابت ہے، لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں انہوں نے اس امداد پر مصرف کو ختم کر دیا اور اس کی وجہ یہی بیان کی کہ اب وہ سبب اور ضرورت باقی نہیں رہی جس کی بنیاد پر یہ مد بیان کیا گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں اس مد میں زکوٰۃ کے اموال دیئے جاتے تھے۔

اجتہادی مسائل میں تمام فقہاء نے تبدیلی کے حکم کے اصول کو تسلیم کیا ہے، البتہ منصوص احکام کے بارے میں اختلاف ہے۔ نیز یہ کہ عقائد اور عبادات کے بارے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

ابن قیم جوزی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے لکھتے ہیں:

''قانون اور انسانی معاشرہ کا باہمی رشتہ نہ جاننے کے سبب لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے، جس نے اسلامی شریعت کے دائرے کو بالکل محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جس شریعت میں انسانی مصالح کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو اس میں اتنی تنگیوں کی گنجائش کس طرح ممکن ہے۔؟'' (۹)

موجودہ دور کے علماء کے سامنے مصالح عامہ کی کوئی حیثیت نہیں، انہیں وہ دوسرے اور تیسرے درجے میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب کہ قدیم فقہاء نے قرآن وسنت کی روشنی میں جو اصول وضع کیے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہمیت مصلحت عامہ کو دی گئی ہے تمام قدیم فقہاء یہی کہتے رہے کہ: شریعت سراسر مصلحت ہے، صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے تمام اجتہادات کی بنیاد اسی بات پر ہے کہ لوگوں کو قرآن وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ استحسان، مصالح، مرسلہ، عرف وعادت کا اعتبار اسی بنا پر کیا گیا ہے۔ ابوحنیفہؒ اور مالکؒ جیسے اولین فقہاء نے اسی لیے یہ اصول وضع کیے ہیں اور انہیں قانون سازی کا مأخذ ومصدر تصور کیا ہے۔ تاکہ لوگ کسی مرحلے پر تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔ اب صورت حال اس کے برعکس ہے، جس بنیاد پر استحسان اور مصالح مرسلہ حل مسائل کے لیے ایجاد کیے گئے تھے، اب اس بنیاد سے صرف نظر کر لیا گیا ہے اور یہ بات اس سے بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ بعض ایسے مسائل میں قدیم فقہاء کی رائے اور فتوے سے رجوع کیا ہے جہاں خود ان کے اپنے معاملات متاثر ہوتے تھے۔ (۱۰)

یہ صورتِ حال بطور خاص ان علماء کے لیے لمحہ فکر یہ ہے جو اپنے آپ کو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور بڑی شد ومد کے ساتھ فقہ حنفی کی پیروی کرتے ہیں۔ ابوحنیفہؒ مصالح عامہ کی رعایت اور احترام میں ایک ایسی انتہاء تک چلے گئے تھے جہاں تک ان کے ہم عصر فقہاء نہ جا سکے، اس معاملے میں ابوحنیفہؒ نے جس جرأت وہمت کا اظہار کیا، دوسرے نہ کر سکے، اور انہوں نے جن حدوں کو انتہائی دور اندیشی اور نکتہ رسی کے ساتھ پار کیا، وہاں دوسروں کے قدم ڈگمگا گئے مگر آج ان کا اور ان کی فقہ کا نام لینے والے مصالح عامہ کے احترام میں سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔

اگر اہم اجتہاد کے ذریعے فقہ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی اس خواہش میں مخلص ہیں کہ روح تشریع باقی

رہے، اور ایسا کرنا ہم پر فرض کفایہ ہے، اور جب تک ایسا نہیں ہوگا ہم ان مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو سائنسی اور مشینی دور پیدا کر رہا ہے تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دو بنیادوں کا فراہم کرنا بہت ضروری ہے۔ ان میں ایک بنیاد تنظیمی ہے اور دوسری تعلیمی۔

تنظیمی بنیاد

آج ہمارے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کے لیے ایک نیا اسلوب اختیار کریں اور وہ اسلوب یہ ہے کہ ایک منظّم جماعت بڑے بڑے مسائل کے بارے میں مل کر اجتہاد کا فریضہ انجام دے تا کہ یہ اجتماعی اجتہاد انفرادی اجتہاد کی جگہ لے سکے۔ اس طرح ہم اجتہاد کو اس کی ابتدائی صورت کی طرف واپس لے جا سکیں گے جو خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں قائم تھی جب کہ خلیفہ کی جانب سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جمع کیا جاتا تھا اور پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے ان سے رائے لی جاتی تھی۔

اب اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ عالمی سطح پر ایک فقہی اکیڈمی قائم کی جائے جو علمی اور لسانی اکیڈمیوں کے طرز پر کام کرے اور اس فقہی اکیڈمی میں ہر اسلامی ملک سے معروف ترین، اور ٹھوس علم رکھنے والے ان فقہاء کو شامل کیا جائے جن میں شرعی علم کے ساتھ ساتھ، روشن خیالی اور سیرت وتقویٰ کی خوبیاں بھی ہوں۔

ان شخصیتوں کے ساتھ ایسے قابل اعتماد مسلمان علماء کو بھی شامل کیا جائے جو جدید علوم کے مختلف شعبوں میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں تا کہ ان کی ماہرانہ رائے پر فقہاء غیر فقہی معاملات میں اعتماد کر سکیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ فقہ اکیڈمی سے صادر ہونے والے فقہی احکام ہر موضوع اور ہر مسئلہ کے متعلق حقیقت حال کے فہم وادراک پر مبنی ہوں اور اس اکیڈمی کے فقہاء پر یہ الزام نہ لگ سکے کہ وہ جدید سائنسی اور اجتماعی امور کے خصوصی مسائل کے بارے میں حلال اور حرام کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی اصل حقیقت اور صحیح صورت حال سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے۔ اس اسلامی فقہی اکیڈمی کے بعض ارکان کو کل وقتی بنیاد پر کام میں لگنا ہوگا اور بعض کو جز ووقتی معاونین کی طرح کام کرنا ہوگا۔

ان حضرات کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مطالعہ، تحقیق اور اجتہادی فکر کے لیے وقف ہوں تا کہ جس موضوع یا جدید مسئلہ کے متعلق ضرورت پیش آئے۔ اسلام کا حکم بیان کرسکیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تحقیقات اور نتائج کو مجلّہ یا کتب کے ذریعہ شائع کرنے کا اہتمام کریں۔

سب سے اہم کام جس کا آغاز اس اکیڈمی کو کرنا چاہیے وہ فقہ اسلامی کی ایک دائرہ المعارف کی تیاری ہے جس میں تمام مستند فقہی مسالک کی مدون شدہ فقہی احکام کو ہر مسئلہ اور ہر رائے کے مستند حوالہ اور متعلقہ مسلک کے مرجع کے ساتھ پیش کر دیا جائے اور انسائیکلو پیڈیا کے مروجہ طریق کار کے مطابق فقہی موضوعات اور احکام کو حروف ہجاء کی ترتیب کے لحاظ سے عنوانات قائم کر کے جمع کر دیا جائے۔

دائرہ معارف فقہیہ عام کی تیاری کے علاوہ اکیڈمی کو یہ کام بھی سونپا جائے کہ مختلف مسالک کے فقہ کی بنیادی کتابوں کی فہرست ہجائی ترتیب سے شائع کرے تا کہ محققین کی ان تک رسائی ممکن ہو۔ اس کے علاوہ اکیڈمی ان تمام امور اور وسائل کو جمع کرے جو اجتماعی اجتہاد، اس کی تیاری اور اس کا راستہ ہموار کرنے کے لیے اس دور میں ضروری ہیں۔ (۱۱)

تعلیمی بنیاد

اجتہاد کے عمل کا دوبارہ آغاز کرنے کے لیے جو دوسری بنیاد فراہم کی جانی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ شرعی تعلیم کی مطلوبہ اقسام مہیا کی جائیں تا کہ اجتہاد کی قابلیت پیدا کرنے کے مقصد کی سمت پیش رفعت ہو سکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ درجہ اجتہاد کے حصول کے لیے تین عناصر کا پایا جانا ہر مجتہد میں ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

ا) امکانی حد تک پوری گہرائی اور جامعیت کے ساتھ شریعت کے اصول وفروغ کا علم۔

ب) ذہانت، اسلامی شعور اور حالات زمانہ سے آگاہی کا مطلوبہ معیار۔

ج) تقویٰ اور صالح کردار جس کی بنیاد پر اس شخص کی دینی امانت پر بھروسہ اور اس کی بات پر اعتماد قائم ہو کہ وہ کسی خوف یا لالچ کی وجہ سے حق بات سے ہٹ کر کچھ کہنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

یہاں یہ بات لائق توجہ ہے کہ اجتہاد کے عنصر اول کا حصول (یعنی شریعت کے اصول اور فروع کا جامع اور گہرا مطالعہ) آج کے مخلص فی الفقہ کے لیے جو اس مسئلہ میں ہمہ تن مصروف ہو۔ پہلے کی نسبت آسان تر ہو گیا ہے اس لیے کہ معلومات کے ذرائع پوری طرح میسر ہیں اور علم شریعت کے تمام ماخذ مدون ہو چکے ہیں۔ بالخصوص سنتِ نبوی (جو اگر چہ ماخذی درجہ بندی میں کتاب اللہ کے بعد آتی ہے) جس پر اجتہاد کے پورے عمل اور مجتہد کی پوری کوششوں کا دارومدار ہے اور اگر اس کی ہدایات کی بابت تحقیق نہ کی جائے تو عالم بھول، بھیلوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے

دوسرا عنصر ذہانت، شعور اور زمانہ سے آگاہی اجتہاد کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ سرسری فکر رکھنے والے افراد سے علمی فکر رکھنے والے اصحاب الگ پہچانے جاسکیں اور ان کی فہم و بصیرت پر بھروسہ کیا جا سکے۔

تیسرا عنصر تقویٰ کا اس لیے ضروری ہے کہ یہ وہ حفاظتی تدبیر ہے جس کے نہ ہونے سے اعتماد جاتا رہتا ہے اور اجتہاد کا عمل دین کے نام پر تجارت بن کر رہ جاتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس بات سے انکار یا اس میں شک کر سکتا ہے کہ ہماری شریعہ فیکلٹیاں اور اسلامی یونیورسٹیاں مطلوبہ قابلیت پیدا نہیں کر رہیں۔ ان کی موجودہ حالت، ان میں داخلہ کی عمومی شرائط، ان میں تدریس کے طریقے اور ان کی مدت، مطلوبہ نگرانی کا فقدان اور جامعات کے اندر اور باہر طلبہ کے صحیح اور پختہ اسلامی کردار کی ضمانت کے نہ ہونے سے، اور ان کے مقاصد کا کاغذ کے ان پرزوں میں محصور ہو جانے سے جنہیں ڈگری کہا جاتا ہے اور جس کو طالب علم محض حصول رزق کا ذریعہ سمجھ کر ان کا طلب گار ہوتا ہے بجائے اس کے کہ وہ علم برائے علم اور خشیتِ الٰہی کا طلب گار ہو، یہ تمام حقائق کسی امید افزاء صورت کی نشان دہی نہیں کرتے۔

لہذا یہ ضروری ہے کہ ایسے جامعات اور خصوصی ادارے قائم کیے جائیں جو اپنے نظام تعلیم، نصاب ہائے تدریس، داخلہ کی شرائط اور طلبہ کی دینی، نفسیاتی اور فکری تربیت کے منصوبے ایسی بنیادوں پر مرتب کریں جس سے بالآخر طلبہ کے اندر اجتہاد کے عناصر ثلاثہ کی تکوین عمل میں آسکے ان جامعات اور خصوصی اداروں کو ان مدتوں کا پابند بھی نہیں ہونا چاہیے جو رواجی طور پر دوسری فیکلٹیوں میں مقرر کر لی جاتی ہیں جن کا مقصد محض فارغ التحصیل طلبہ کی پیداوار اسی طرح تیزی سے نکالتے رہنا ہوتا ہے جس طرح مشینوں کے ذریعے کارخانوں سے پیداوار نکلتی رہتی ہے

ان طلبہ کو درمیانی مدارج سے گزار کر ایک ایسے مرحلے تک پہنچا دینا چاہیے جہاں یہ عام رواجی جامعات کے فارغ التحصیل افراد کی طرح نہ ہوں، ان کی ذہنی اور فکری نوعیت ان سے مختلف ہو، اور یہ اس سانچے میں ڈھل چکے ہوں جس میں ڈھلے بغیر اس ذمہ داری کو اٹھانا ممکن نہیں ہے۔

ان غیر معمولی شرائط کے مطابق شریعت کے طالب علموں کی ایک جماعت کی خصوصی تربیت کا انتظام اور پھر انہیں کسی اختصاصی ادارہ، فیکلٹی یا جامعہ میں رکھ کر خاص مقاصد کے لیے تیار کرنے کی مثالیں دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ملتی ہیں جہاں علم کے بعض شعبوں کے لیے اختصاصی کالج یا فیکلٹیاں قائم کی جاتی ہیں، ان میں داخلہ اور تعلیم کے لیے کڑے معیار کی شرائط اور پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور ان میں ہر ایسے طالب علم کو داخل نہیں کیا جاتا جسے کسی دوسری عام یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہو۔

یہاں یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ ہماری تجویز کا مقصد یہ نہیں کہ وہ طلبہ جو ان اداروں سے فارغ ہو کر نکلیں گے جن کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، ان کو تعلیم کے اختتام پر اجتہاد کا پروانہ مل جائے گا بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہی وہ صحیح راستہ ہے جس پر چل کر ایسے افراد تیار ہو سکیں گے جن میں اجتہاد کی صلاحیتیں ہوں گی اور وہ اسلاف کی اس فکر اور عمل کو آگے بڑھا سکیں گے۔

میں اس موقعہ پر یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اجتہاد کے عمل کو زندہ اور جاری رکھنے کے سلسلے میں اگر ہم صرف ابوحنیفہؒ کے طریق کار ہی کی پیروی کر لیں تو بھی یہ غور ختم ہو جائے گا کہ آج کے دور میں اجتہاد کیسے ممکن ہے اور کس میں یہ صلاحیت ہے کہ اسے مجتہد تسلیم کیا جائے؟

ابوحنیفہؒ نے تمام تر صلاحیتوں کے باوجود چالیس رکنی مجلس فقہ بنائی تھی، اور اس میں تمام متعلقہ اور مطلوبہ علوم کے ماہر جمع تھے، ان کی مدد سے وسیع تر بنیاد اجتہاد کا عمل بروئے کار لایا گیا۔ انہوں نے اس ضمن میں حکومت وقت سے کوئی مدد نہ لی۔ یہ عظیم الشان کام اپنے ذاتی ذرائع سے کیا، آج دنیا کے نقشہ پر چالیس سے زیادہ مسلم حکومتیں موجود ہیں۔ ان میں بعض کی یہ خواہش بھی ہے کہ اسلام حکومتی اور اجتماعی سطح پر نافذ ہو، مالی اور مادی وسائل کی اس حد تک فراوانی ہے کہ شائد گزشتہ چودہ صدیوں میں سے کسی دور میں بھی اتنی فراوانی میسر نہ ہوئی ہو۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ شہرستانی، الملل والنحل

۲۔ مصطفیٰ احمد زرقاء، الاجتہاد و دور الفقہ فی حل المشکلات ۔الدراسات الاسلامیہ، اسلام آباد۔ش ۴، ج:۲۰، (اکتوبر۔دسمبر ۱۹۸۵ء)۔

۳۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ ۔تتمہ۔ باب:۳۔

۴۔ القرآن: سورۃ النساء ۵۹۔

۵۔ شاہ ولی اللہ، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ۔ص:۲۶۔

۶۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، تقویۃ الایمان ۔(طبع: کراچی۔ت۔ن) ص:۲۱۸۔

۷۔ رسائل ابن عابدین۔۲/ ۱۱۶، ۱۲۵، الفقہ الاسلامی ۔ص:۷۷، ۷۸۔

۸۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کے اجتہادات پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں ان کے تمام اجتہادات کی تفصیل بیان کی ہے ''اولیاتِ عمر'' کے نام سے ایک سو ان اقدامات کا حوالہ دیا ہے جو حضرت عمرؓ نے پہلے پہل کیے۔اس سے پہلے یہ وہ دورِ نبوی میں تھے، اور نہ دورِ صدیقی میں۔

اس موضوع پر مولانا محمد تقی امینی (لکھنؤ۔ بھارت) نے ''شرعی احکام میں حالات و زمانہ کی رعایت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی گفتگو کا محور اور اجتہادات عمرؓ۔ایک اچھی کتاب ہے۔

۹۔ ابن القیم، اعلام الموقعین ۔۴/ ۳

۱۰۔ میری نظر میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ چند ایک کا حوالہ یہاں دیا جا چکا ہے۔ایک اور مثال دینے کی اجازت چاہوں گا۔ فقہائے احناف کے نزدیک زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک ضروری ہے، عہدِ حاضر کے علماء نے اس سلسلے میں جو رویہ اپنا رکھا ہے وہ اہل علم اور اہل فتویٰ کے وقار کے منافی ہے۔صورتحال یہ ہے کہ اگر حکومت اموال زکوٰۃ سے کوئی سماجی بہبود کا کام کرنا چاہتی ہے تو اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے تملیک متحقق نہیں ہوتی لہذا زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔لیکن اس کے برخلاف عربی مدارس میں زکوٰۃ کے مد میں نقد روپیہ آتا ہے۔بھیجنے والا علی الاطلاق بھیجتا ہے ناظم مدرسہ کے نام رقوم آتی ہیں، بسا اوقات ان میں کسی مد کا بھی تعین نہیں ہوتا۔وہاں تملیک کیسے ہوتی ہے؟

پھر اس میں ایک اور قابل اعتراض بات ہے، وہ یہ کہ فقہ حنفی ہی میں یہ ہے کہ بیک وقت کسی کو اتنی رقم نہ دو کہ وہ خود (لینے والا) صاحب نصاب ہو جائے۔ عربی مدارس میں بعض لوگ بیک وقت پچاس ہزار روپے بھیجتے ہیں۔ اگر حیلے کے ذریعے ناظم اس میں تملیک کر بھی لیتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بڑی رقم بیک وقت لے کر بھی وہ کس طرح مستحق زکوٰۃ رہتے ہیں اور صاحب نصاب نہیں بنتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اس صورت میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ بہت سے ناظم صاحبان پہلے سے صاحب نصاب ہوتے ہیں، وہ تو اپنے فتوے کی رو سے بھی زکوٰۃ کی وصولی کا حق نہیں رکھتے۔ بلکہ چاروں فقہی مسالک اس پر متفق ہیں کہ جو شخص پہلے سے صاحب نصاب ہو، اس کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔

۱۱۔ اس قسم کی فقہی اکیڈمی کے قیام کا فیصلہ اس اسلامی کانفرنس میں کیا گیا تھا جو ۱۹۵۱ء میں کراچی (پاکستان) میں منعقد ہوئی تھی، لیکن وہ فیصلہ کاغذی کارروائی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ۱۹۵۶ء میں دمشق یونیورسٹی میں اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی، اس نے منصوبہ بندی کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت مصر نے اس منصوبے کو روبہ عمل لانے اور اس کے لیے مالی وسائل مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ مصر اور شام کے علماء نے مشترکہ طور پر کام کی ابتداء کی مگر وہ کسی منزل تک نہ پہنچا۔

۱۲۔ ۱۹۶۶ء میں کویت کی وزارات اوقاف نے فقہی دائرہ معارف کے منصوبہ کو اپنی تحویل میں لیا، اور پانچ برس تک اس پر کام ہوتا رہا، اس دائرہ معارف کا کچھ حصہ طبع بھی ہو گیا ہے۔ لیکن صرف فقہی دائرہ معارف کی تیاری سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے وہی جامع نظام وضع کرنا ہوگا جس کا میں نے ذکر کیا۔

اس جامع نظام کے قیام میں آج کوئی چیز مانع نہیں ہے اہل علم وفضل بھی ہیں اور مالی وسائل کی بھی فراوانی ہے اور اس حد تک ہے کہ صرف ایک شخص اس کار خیر کی کفالت کر سکتا ہے۔ اس کے جتنے اخراجات ہوں گے اس سے کئی گنا زیادہ اخراجات آج مسلمہ امہ میں ایک شخص برداشت کر رہا ہے۔ اس نظام کے قیام میں صرف یہ امر مانع ہے کہ نہ اہل حل وعقد کو اس کی اہمیت کا احساس ہے اور نہ اہل علم وفضل کو۔